مسئلہ تقسیم دار

اور موجودہ دور میں اس کا انطباق

مصنف

ڈاکٹر سعید عبداللہ حارب

نام کتاب:　مسئلہ تقسیم دار اور موجودہ دور میں اس کا انطباق

مصنف:　ڈاکٹر سعید عبداللہ حارب

مترجم:　شعبہ حسنین ندوی

صفحات:　۴۶

قیمت:

سن اشاعت:

بسم الله الرحمن الرحيم

مقدمہ

دو یا دو سے زائد ''دار'' میں دنیا کی تقسیم کا نظریہ ان مسائل میں گردانا جاتا ہے جن کا ذکر فقہ کی قدیم کتابوں میں ملتا ہے۔ غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت کے سلسلہ میں متعدد احکام اسی نظریہ پر مبنی ہیں۔ فکر اسلامی کے مختلف ادوار میں یہ نظریہ موجود رہا، البتہ وسیع پیمانہ پر اس نظریہ کو شہرت و اہمیت بعد کے ادوار میں حاصل ہوئی، جب بعض مسلم جماعتوں نے اس نظریہ کی روشنی میں غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت بیان کرنا شروع کیا۔ بلکہ بعض حالات میں اس سے متعلق احکام کو خود مسلمانوں پر بھی منطبق کیا گیا جس کی وجہ سے دنیا کی تقسیم سے متعلق فقہ اسلامی کے اس نظریہ کو سمجھنا کافی مشکل ہو گیا، اور یہ سمجھنا بھی مشکل ہو گیا کہ یہ نظریہ جدید دور اور اس کے حالات سے کس قدر ہم آہنگ ہے، کیونکہ یہ نظریہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مطلوب تعلقات کی نوعیت سے مربوط ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کا یہ مسئلہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا دیگر انسانی اقوام کے درمیان باہم تعلقات کا مسئلہ۔ یہ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کی دعوت تمام انسانوں کے لئے اور ہمیشہ کے لئے ہے، اور جو دعوتیں ہمیشہ کے لئے ہوتی ہیں وہ جغرافیائی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی حدود کی پابند نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب یہ دعوتیں ملکوں اور نظاموں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو دوسرے سے تعلقات قائم کرنے اور باقی رکھنے کے تئیں وہ اپنے لئے کچھ قواعد وضوابط بنا لیتی ہیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے سلسلہ میں اسلامی شریعت نے چند اصول وضوابط متعین کئے ہیں۔ اس موضوع کو قدیم اسلامی اصطلاحات میں ''سیر'' کے نام سے جانا جاتا تھا، موجود دور میں اس موضوع کو ''اسلام میں بین الاقوامی تعلقات'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اسلام میں بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت دیگر ادیان سے مختلف ہے۔ اسلام میں اس موضوع میں مختلف مسائل شامل ہیں۔ اس کا تعلق فقہ سے بھی ہے، سیاست سے بھی ہے، تاریخ سے بھی ہے، معاشیات سے بھی ہے اور معاشرتی زندگی سے بھی ہے۔ اس موضوع میں ان تمام مسائل کی باہم آمیزش اس طرح سے ہے کہ ہر مسئلہ کا اثر دوسرے مسئلہ پر پڑتا ہے، لہذا ''اسلام میں بین الاقوامی تعلقات'' کے موضوع کو صرف ایک فقہی یا صرف ایک سیاسی موضوع نہ سمجھا جائے، اس موضوع سے متعلق کسی بھی مسئلہ پر گفتگو اور بحث وتحقیق کو ہمہ جہت پہلو کے ساتھ انجام دیا جائے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ ''دو یا دو سے زائد دار میں دنیا کی تقسیم'' کا مسئلہ اسی موضوع (یعنی بین الاقوامی تعلقات) سے متعلق ہے۔

نظریۂ تقسیم دار کی اصل بنیاد:

ایک سے زائد ریاستوں اور علاقوں میں دنیا کی تقسیم کا تعلق درحقیقت ان قدیم افکار ونظریات سے ہے جو مختلف انسانی گروہوں (مثلاً قبیلہ، ریاست وغیرہ) کے درمیان باہمی تعلقات کے موضوع سے وابستہ ہیں۔ مغرب میں یہ نظریہ اس وقت سامنے آیا جب اہل مغرب نے انسانوں کی تقسیم کی۔ قدیم یونانیوں کے مطابق انسان یا تو یونانی ہیں یا پھر بربر، لہذا یونانیوں کو تمام تر حقوق حاصل تھے، جبکہ بربر ان حقوق سے محروم تھے۔ یہودیوں کے مطابق انسان یا تو ''یہود'' ہیں یا پھر ''جوییم'' (۱) ہیں۔

جب مسیحیت کا ظہور ہوا اور اہل یوروپ نے اس دین کو اپنایا تو ان کے یہاں دنیا میں یا تو ''مسیحی'' تھے یا پھر ''بت پرست''۔ یہ ساری تقسیمیں ہی نسل پرستی پر مبنی ہیں، ان میں تعلقات کے عملی پہلو کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ البتہ اسلام نے دار الاسلام اور دار الحرب کی شکل میں دنیا کی جو تقسیم کی ہے وہ درحقیقت عملی تقسیم ہے، یہ تقسیم مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت (یعنی صلح یا جنگ) کے نظریہ پر مبنی ہے۔ دار الحرب اور دار الاسلام

کی تقسیم کا یہ نظریہ اگر چہ بہت زیادہ عام ہے، لیکن اس تقسیم کی ابتداء کی متعین تاریخ کے تعلق سے قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، یہ بھی نہیں معلوم کہ اس تقسیم کے اسباب کیا رہے ہیں، یا اس کے تاریخی وجغرافیائی ابعاد کیا رہے ہیں، یا اس میں غیر دینی عوامل (مثلاً نسلی، تہذیبی اور معاشرتی) کا اثر کس قدر ہے، یہ بھی نہیں معلوم کہ تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار میں پیدا ہونے والے مختلف مذاہب ومسالک اور گروہوں وفرقوں (جن کی بنیاد پر بہت سی ریاستیں وجود میں آئیں) کے کس قدر اثرات اس تقسیم پر مرتب ہوئے ہیں۔ درحقیقت تقسیم کا یہ نظریہ فقہاء کے آراء واقوال میں اس وقت ظاہر ہونا شروع ہوا جب فتوحات کے نتیجہ میں اسلامی حکومت میں وسعت ہوئی اور بہت ساری ریاستیں اور علاقے اسلامی حکومت کے زیر نگیں آگئیں، یہ ریاستیں اور علاقے اپنے مذاہب وادیان اور تہذیب وثقافت کے ساتھ اسلامی ریاست میں ضم ہوگئیں، ان میں سے جن ریاستوں نے اسلام قبول کرلیا وہ ہر طرح سے اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کا حصہ ہوگئیں اور ان کی تہذیب وثقافت اور معاشرتی اقدار میں تبدیلیاں کی گئیں، تاکہ وہ اسلام کے موافق ہوجائیں، اور جن ریاستوں نے اسلام قبول نہیں کیا ان کے ساتھ ''نظام ضمانت'' (ذمی) کے ذریعہ تعلقات کو قائم کیا گیا، یہ نظام درحقیقت ایک معاہدہ ہے جس کے تحت حکومت سے ایک شہری کے تعلقات اس طرح قائم ہوتے ہیں کہ اس کے دینی، تہذیبی اور معاشرتی حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اس طرح ایک جانب اسلامی ریاست کے مختلف عناصر کے درمیان داخلی تعلقات کو واضح طور پر بیان کردیا گیا ہے، البتہ دیگر ریاستوں اور گروہوں سے اسلامی ریاست کے تعلقات کی بنیادیں اور اصول وضوابط واضح طور پر متعین نہیں ہیں، جن پر بھروسہ کرتے ہوئے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مطلوبہ تعلقات کے واضح نقوش کھینچے جاسکیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جو واحد بنیاد ہمیں ملتی ہے وہ ہے دو یا دو سے زائد دار میں دنیا کی تقسیم۔ متاخر فقہاء ومحققین نے دنیا کی تقسیم کے نظریہ کا مطالعہ ہمت جہت

پہلو سے کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ جدید دور میں ریاستوں کی کیفیت اوران کے درمیان تعلقات کی نوعیت بدل چکی ہے، اسی طرح وہ تاریخی احوال بھی بدل گئے ہیں جن میں اس اصطلاح کا ظہور ہوا تھا۔موجودہ دور میں مختلف مسلم مفکرین کی جانب سے اس موضوع سے متعلق متعدد مطالعات سامنے آئے ہیں جن میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔اس ضمن میں قابل ذکر مسلم مفکرین کے نام یہ ہیں: سید ابوالاعلی مودودی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر عبداللہ بن بیہ، ڈاکٹر محمد رآفت عثمان، شیخ عبدالوہاب خلاف، شیخ محمد ابوزہرہ، ڈاکٹر علی علی منصور، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، شیخ عبداللہ بن یوسف الجدیع اور ڈاکٹر سیف عبدالفتاح۔اس موضوع سے متعلق محققین کی آراء اگرچہ مختلف ہیں، لیکن اس موضوع پر از سر نو بحث ومناقشہ کرنا ایک اچھا اور بہتر قدم ہے۔

تقسیم دار کے محاور:

مسلم فقہاء لفظ ''الدار'' کا استعمال ''ریاست نی ئی کے معنی میں کرتے تھے، یا ''اقلیم'' (صوبہ) کے معنی میں کرتے تھے جو کہ جدید بین الاقوامی قانون کے مطابق ریاست ہی کا ایک حصہ ہے۔کبھی کبھی لفظ ''الدار'' کا اطلاق ملک (البلد) کے لئے بھی ہوتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **''فأصبحوا في دارهم جاثمين''(۲)۔**

ایک دوسری جگہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: **''والذين تبوؤوا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم''**۔علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: ''جب مسلمانوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کرلی، ان کے پاس اللہ کے رسول ﷺ آ گئے اور وہ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اوران کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو مدینہ کی حیثیت دارالاسلام کی ہوگئی، اور ایک ایسے قلعہ کی ہوگئی جس میں مسلمان پناہ لیا کرتے تھے''(۳)۔

ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں: ''الدار سے مراد اقلیم ہے،۔۔۔اس سے مراد رہائشی

مکان نہیں ہے''۔فقہاء نے لفظ''دارالاسلام''اور''دارالحرب'' کا استعمال کر کے دو مختلف نوعیت کے اقلیم کی جانب اشارہ کیا ہے۔ان اصطلاحات کا استعمال بہت زیادہ عام ہے۔ان کے ہم معنی چند دیگر اصطلاحات کا بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً دارالاسلام کے لئے''دارالھجرت''،''دار السلم''(دارصلح) اور''دارالدعوۃ'' کا استعمال ہوتا ہے، اور دارالحرب کے لئے''دارالکفر''،''دار الشرک''اور''أرض العدو''(سرزمین دشمن) کا استعمال ہوتا ہے۔فقہاء نے دنیا کو دو''دار'' میں تقسیم کیا ہے:

دارالاسلام:

جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک''دارالاسلام وہ ہے جہاں مسلمان آباد ہوں اور جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں۔اگر اسلامی احکام نافذ نہ ہوں تو وہ دارالاسلام نہیں ہوسکتا، گرچہ وہ دار الاسلام سے متصل ہی کیوں نہ ہو''(۴)۔

علامہ کاسانی اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کوئی بھی علاقہ دار الاسلام اس وقت ہوتا ہے جب وہاں اسلامی احکام نافذ العمل ہوں''(۵)۔

لہٰذا دارالاسلام اس ریاست یا علاقہ کو کہیں گے جہاں اسلامی احکام کی حکمرانی ہو اور جہاں مسلمان اپنے دینی واسلامی شعائر کو بغیر کسی خوف اور اندیشہ کے انجام دیتے ہوں۔اس ریاست اور علاقہ کی حفاظت اور اس کا دفاع مسلمانوں پر واجب ہے۔

دارالاسلام ہونے کے لئے فقہاء نے یہ شرط بیان کی ہے کہ اس ریاست اور علاقہ میں اسلامی احکام کی حکمرانی ہو۔فقہاء نے دارالاسلام کے لئے یہ شرط قرار نہیں دی ہے کہ وہاں کے تمام باشندوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

بلکہ بعض فقہاء تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ ریاست اور علاقہ بھی دارالاسلام ہوگا جہاں گرچہ ایک بھی مسلمان نہ ہو لیکن اس کا حاکم مسلمان ہو اور وہ اس ریاست میں اسلامی احکام نافذ

کرتا ہو۔اسی مفہوم میں بعض شافعی علماء نے لکھا ہے کہ ''دارالاسلام کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہاں مسلمان بستے ہوں، بلکہ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہاں کا حکمراں مسلمان ہو'' (۶)۔

''دارالاسلام کے باشندے اگر فاسق ہوں تب بھی اسے دارالاسلام سمجھا جائے گا، بشرطیکہ وہاں اسلامی شعائر کا غلبہ ہو۔ جب تک یہ صورتحال باقی رہتی ہے اس وقت تک وہاں کے باشندوں کا فسق اس صفت کو ختم نہیں کرسکتا'' (۷)۔

معلوم ہوا کہ جمہور علماء کے یہاں کوئی بھی ریاست یا علاقہ دارالاسلام اسی وقت خیال کیا جاتا ہے جب کہ وہاں اسلامی احکام کا نفاذ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ اور چند دیگر علماء کا خیال ہے کہ کسی بھی علاقہ کو دارالاسلام اسی وقت سمجھا جائے گا جب کہ وہاں کے مسلم باشندے اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کے سلسلہ میں محفوظ اور مطمئن ہوں، اور وہ علاقہ دارالاسلام سے متصل ہو۔ اگر وہاں مسلمانوں کے لئے امن وامان نہ ہو اور وہ نہ ہی وہ دارالاسلام سے متصل ہو تو اسے ''دارالحرب'' سمجھا جائے گا۔

امام محمد بن حسن الشیبانی لکھتے ہیں: اگر ذمی معاہدہ کو ختم کر کے مسلمانوں سے جنگ کریں اور ان کے شہر پر غالب آجائیں اور اس شہر پر ان کی حکومت جائز ہو، علاوہ ازیں وہاں پر بسنے والے مسلمان محفوظ ہوں تو اسے دارالحرب نہیں کہیں گے، کیونکہ اس شہر میں مسلمان محفوظ و مطمئن ہیں۔

علامہ سرخسی تحریر فرماتے ہیں: جس علاقہ میں مسلمان محفوظ اور مطمئن نہ ہوں وہ درحقیقت دارالحرب ہے، دارالاسلام تو اس علاقہ کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کے زیر نگیں ہو، اور اس علاقہ کے مسلمان محفوظ و مطمئن ہوں (۸،۹)۔

جدید حالات کے پیش نظر یہ بات سامنے آتی ہے کہ دارالاسلام ہونے کے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کوئی علاقہ یا شہر دارالاسلام کے پڑوس میں واقع ہے۔ موجودہ

دور میں رابطہ کے ذرائع بدل چکے ہیں۔موجودہ دور میں ایک انسان دنیا کے بعید ترین علاقہ میں کم سے کم وقت میں پہنچ سکتا ہے۔اسی طرح قوموں اور ملکوں کے رعب اور وقار و عظمت کی بنیاد طاقت وقوت نہیں رہ گئی ہے، بلکہ آج کے دور میں اصل اہمیت میڈیا اور اس طرح کے دیگر اداروں کی ہے جن کے ذریعہ سے قوموں اور ملکوں کے ہیبت و رعب اور طاقت وقوت کو دوسروں کے دلوں میں بٹھایا جاتا ہے۔میڈیا کے ذریعہ سے ایسی خبریں نشر کی جاتی ہیں جن سے ملکوں کی قوت و عظمت اور رعب و ہیبت کا اظہار ہو۔لہذا موجودہ دور میں صرف فوجی طاقت وقوت ہی ہیبت و رعب کا ذریعہ نہیں رہ گئی ہے، بلکہ اس کے بہت سے دیگر ذرائع بھی ہو گئے ہیں، مثلاً فضائیات، سائنسی ایجادات، ٹکنالوجی کی ترقی اور معاشی قوت وغیرہ۔

بعض احناف کا یہ کہنا ہے کہ کسی علاقہ کو دار الحرب قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں احکام کفر کا غلبہ ہو، فتاوی ہندیہ میں تحریر ہے : ''دار الحرب اس وقت دار الاسلام ہوجاتا ہے جب وہاں اسلامی احکام کا غلبہ ہوجائے اور دار الاسلام اس وقت دار الحرب ہوجاتا ہے جب وہاں احکام کفر کا غلبہ ہوجائے''۔

مالکی حضرات کا کہنا ہے کہ ''دار الاسلام وہ علاقہ یا ملک ہے جہاں مسلمانوں کے احکام نافذ ہوں''(۱۰)۔

علماء شوافع کا کہنا ہے : ''ہر وہ علاقہ یا ملک جس میں مسلمان بغیر کسی محافظ و مددگار اور بغیر جزیہ کے اسلام کی دعوت دیں، جہاں ذمیوں پر مسلمانوں کا حکم نافذ ہو اور اہل سنت پر اہل بدعت غالب نہ آئیں وہ دار الاسلام ہے(۱۱)۔

حنبلی علماء کے یہاں دار الاسلام اسے کہتے ہیں جہاں مسلمان آباد ہوں اور جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں۔اگر وہاں اسلامی احکام نافذ نہ ہوں تو اسے دار الاسلام نہیں کہیں گے، گرچہ وہ علاقہ کسی دار الاسلام سے متصل ہی کیوں نہ ہو۔شہر طائف گرچہ مکہ سے بہت ہی قریب

تھالیکن فتح مکہ کے بعد اسے دارالاسلام نہیں سمجھا گیا (۱۲)۔

اباضی علماء کے مطابق دارالاسلام اسے کہتے ہیں جہاں اسلامی احکام کا غلبہ ہو اور جہاں مسلمان و ذمی محفوظ و مامون ہوں (۱۳)۔

زیدی علماء کہتے ہیں کہ دارالاسلام وہ علاقہ ہے جہاں کلمۂ شہادت اور نماز کا ظہور ہو اور جہاں کافرانہ عادتوں کا ظہور نہ ہو، الا یہ کہ مسلمان نے کسی کو پناہ دے رکھی ہو (۱۴)۔

علامہ ابن حزم نے دار الاسلام کے لئے صرف ایک شرط قرار دی ہے، ان کے مطابق دارالاسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کا حاکم مسلمان ہو (۱۵)۔

بعض متاخرین فقہاء مثلاً شیخ عبدالوہاب خلاف نے بھی اسی رائے کو اپنایا ہے۔ شیخ عبدالوہاب خلاف کہتے ہیں کہ ''دارالاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور جہاں کے باشندے، خواہ مسلمان ہوں یا ذمی، مسلمانوں کی امان میں محفوظ ہوں'' (۱۶)۔

شیخ ابوزہرہ تحریر کرتے ہیں : ''دار الاسلام اس ریاست کو کہتے ہیں جہاں کسی مسلمان حکمران کی حکمرانی ہو اور جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہو'' (۱۷)۔

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں : ''اس مسئلہ میں علماء اسلام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کوئی بھی دارالکفر صرف اسلامی احکام کے غلبہ اور مسلمانوں کے تسلط سے دارالاسلام ہو جاتا ہے'' (۱۸)۔

دارالحرب:

دارالحرب اسے کہتے ہیں جہاں اسلام کے دینی و سیاسی احکام کی حکمرانی نہ ہو، نہ ہی وہاں کا حکمران مسلمان ہو، بلکہ وہاں پر کفار کو غلبہ اور طاقت وقوت حاصل ہو اور وہاں احکام کفر کا غلبہ ہو۔ متاخر علماء نے دارالحرب کے لئے ایک شرط یہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے درمیان اور اسلامی حکومت کے درمیان کسی طرح کا معاہدہ یا پرامن تعلقات نہ ہوں۔ دارالحرب کی تعریف

کے سلسلہ میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں دو آراء سامنے آتی ہیں:

پہلی رائے: اس رائے کے مطابق دار الحرب اسے کہتے ہیں جہاں احکام کفر کا غلبہ ہو، جہاں مسلمانوں کو قوت وسلطنت حاصل نہ ہو، جہاں اسلامی احکام کا نفاذ نہ ہو اور نہ ہی اس کے درمیان اور دار الاسلام کے درمیان کسی طرح کا کوئی معاہدہ ہو۔ یہی جمہور علماء کی رائے ہے (۱۹)۔

امام محمد بن حسن الشیبانی لکھتے ہیں: ''اگر کسی دار الحرب کے باشندوں سے مسلمانوں نے یہ معاہدہ کیا ہو کہ وہ ان پر اپنے احکام نافذ نہیں کریں گے تو اسے دار الحرب کہتے ہیں''۔

علامہ سرخسی لکھتے ہیں: ''جہاں مسلمانوں کے احکام نافذ ہوں وہ علاقہ دار الاسلام ہوجاتا ہے، مذکورہ علاقہ میں چونکہ مسلمانوں کا حکم نافذ نہیں ہے اس لئے اسے دار الحرب کہیں گے، دار الحرب اسے کہتے ہیں جہاں کفار کا حکم نافذ ہو'' (۲۰)۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''اگر کسی علاقہ میں احکام کفر کا غلبہ ہو تو وہ دار الکفر ہوجاتا ہے'' (۲۱)۔

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں: ''جب تک کسی علاقہ میں اسلامی احکام نافذ نہ ہوں وہ دار الاسلام نہ ہوگا، گرچہ وہ کسی دار الاسلام سے متصل ہی کیوں نہ ہو'' (۲۲)۔

پہلی رائے کے مطابق دار الاسلام اور دار الحرب میں فرق طاقت وقوت میں غلبہ کے ذریعہ ہوتا ہے، لہذا جس ریاست اور علاقہ میں اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو اسے دار الاسلام کہیں گے، اور جس ریاست وعلاقہ میں اسلام ومسلمانوں کو غلبہ حاصل نہ ہو اسے دار الحرب کہیں گے۔

دوسری رائے: یہ رائے امام ابوحنیفہ اور زیدیہ فرقہ کی ہے۔ ان حضرات کے مطابق کسی ریاست یا علاقہ میں صرف غیر مسلموں کی طاقت وسلطنت سے وہ دار الحرب نہیں ہوجاتا،

بلکہ دارالحرب ہونے کے لئے تین شرطیں نہایت ضروری ہیں:

الف — اس علاقہ یا ریاست میں احکام کفر کا غلبہ ہو۔

ب — وہ دارالحرب سے متصل ہو۔

ج — وہاں اسلامی امان کے ذریعہ کسی مسلمان یا ذمی کی حفاظت نہ کی جا سکے۔

درحقیقت ان حضرات نے طاقت وقوت اور سلطنت کو بنیاد نہیں بنایا ہے، بلکہ انہوں نے مسلمان وذمی کی امان وحفاظت کو بنیاد بنایا ہے۔اس رائے پر اگر عمل کیا جائے تو بہت سے ایسے علاقے نکل آئیں گے جن پر نہ ہی دار الاسلام کا اطلاق ہو سکے گا اور نہ ہی دارالحرب کا، مثلاً:

الف — وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو طاقت وقوت اور سلطنت حاصل نہ ہو۔

ب — وہ علاقے جو مسلمانوں کے قریب میں واقع ہوں۔

شافعی علماء کے یہاں دارالحرب اسے کہتے ہیں جہاں اسلامی دعوت ظاہر نہ ہوتی ہو اور جہاں ذمیوں پر مسلمانوں کا حکم نافذ نہ ہوا ہو (۲۳)۔

حنبلی علماء دارالحرب اسے کہتے ہیں جہاں احکام کفر کا غلبہ ہو۔

معاصر عالم شیخ عبدالقادر عودہ لکھتے ہیں: ''دارالحرب میں تمام وہ غیر اسلامی ممالک شامل ہیں جہاں مسلمانوں کی حکمرانی نہ ہو اور جہاں اسلامی احکام کا غلبہ نہ ہو، خواہ ان ممالک کی حکمرانی کسی ایک ریاست کو حاصل ہو یا متعدد ریاستوں کو، خواہ وہاں کے مستقل باشندوں میں مسلمان موجود ہوں یا موجود نہ ہوں، جب تک مسلمان اسلامی احکام کو غالب نہ کر سکیں گے وہ دار الحرب ہی رہے گا'' (۲۴)۔

شیخ عبدالوہاب خلاف لکھتے ہیں: ''دارالحرب اسے کہتے ہیں جہاں اسلامی احکام نافذ نہ ہوں اور جہاں کے باشندے مسلمانوں کے امان کے ذریعہ محفوظ نہ ہوں'' (۲۵)۔

دارالعہد:

دارالعہد کا نظریہ اسلامی حکومت وریاست کے استحکام کے بعد ظہور پذیر ہوا، جیسے جیسے اسلامی ریاست کے تعلقات وروابط میں ترقی آتی گئی اور اسلامی ریاست کے جدید احکام وحالات سامنے آتے گئے ساتھ ہی ساتھ دارالعہد کے اس نظریہ میں بھی ترقی وتبدیلی آتی گئی۔ ابتدائی دور میں دیگر ممالک سے اسلامی ریاست کے تعلقات کی نوعیت جنگی تھی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات تبدیل ہوتے گئے، اسلامی ریاست کو استحکام حاصل ہوا، اس کے رقبہ میں وسعت آئی اور دیگر قوموں وممالک سے اس کے رابطہ میں اضافہ ہوا۔ لہٰذا فقہاء اس موضوع کے مطالعہ اور اس پر غور وفکر کی جانب متوجہ ہوئے۔ دارالعہد میں مسلمانوں نے اپنی شریعت نافذ کی اور وہاں کے باشندوں کو چند شرائط اور اصول وضوابط کے ساتھ مسلمانوں کے ذمہ وامان میں داخل کیا، اور ساتھ ہی ساتھ اس ملک کی شریعت واحکام کو بھی باقی رکھا، اس طرح یہ ملک ان ممالک کے مشابہ ہے، جنہیں معاہدہ کے سبب کامل آزادی حاصل نہیں ہوتی۔

دستاویزات اور معاہدات کے ذریعہ دارالعہد اسلامی ریاست سے مربوط ہوتا ہے۔ اس ملک کو بھی دارالعہد کہتے ہیں جس کے باشندوں نے مسلمانوں سے جنگ نہ کی ہو اور نہ ہی دشمنی کی ہو۔ اسی طرح دارالعہد میں وہ تمام ممالک شامل ہیں جو ایسے دستاویزات کے ذریعہ اسلامی ریاست سے مربوط ہیں جو اسلامی ریاست اور غیر اسلامی ریاست کے درمیان تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دارالعہد میں وہ ممالک بھی شامل ہیں جن کے اور مسلمانوں کے درمیان معاہدات تو نہیں پائے جاتے، البتہ انہوں نے مسلمانوں سے کبھی جنگ نہیں کی ہوتی ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کی ہوتی ہے(٢٦)۔

شیخ محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں: ''دارالعہد ایک ایسی حقیقت ہے جو حالات کے نتیجہ میں سامنے آئی ہے، بہت سے ایسے قبائل اور ممالک بھی تھے جو مکمل طور پر مسلمانوں کے زیرنگیں

نہیں آئے تھے، مسلمانوں کو ان ممالک میں حکومت وسلطنت بھی حاصل نہیں تھی، البتہ مسلمانوں کا ان ممالک سے معاہدہ تھا، اور وہاں انہیں سیادت حاصل تھی، گرچہ بعض احوال میں یہ سیادت مکمل طور پر حاصل نہیں تھی۔ بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ اس طرح کے ممالک بھی دار الاسلام کے عموم میں داخل ہیں، کیونکہ مسلمانوں نے یہ معاہدات اسی وجہ سے کئے تھے کیونکہ انہیں قوت وسلطنت حاصل تھی۔ لیکن جن فقہاء نے اسلامی بین الاقوامی قوانین کے موضوع پر لکھا ہے (مثلاً امام شافعی اور امام محمد بن حسن الشیبانی) ان کا کہنا ہے کہ دار العہد ایک الگ قسم ہے''(۲۷)۔

فقہاء کے اقوال کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ دار الاسلام اور دار الحرب کی تعریف کے سلسلہ میں ان کے درمیان اتفاق نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ ان دونوں دار اور دار العہد کی کوئی متعین تعریف نہیں پائی جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تقسیم کا تعلق تاریخ اور اس زمانہ سے ہے جس زمانہ میں اس اصطلاح اور اس کے مشتقات کا ظہوا ہوا۔ اسلامی فتوحات اور جنگوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت کے پیش نظر یہ تقسیم بالکل واضح تھی۔ پھر زمانہ کی تبدیلی، اسلامی ریاست کے استحکام کے نتیجہ میں تعلقات کی نئی نوعیت کے ظہور، اور ''معاہدہ'' کی شکل میں ان تعلقات کی نئی شکل ظاہر ہونے کے بعد اس تقسیم کی ایک نئی شکل یعنی 'دار العہد' وجود میں آئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تقسیموں میں یہ بات بنیادی ہے کہ کہاں پر کون سے احکام غالب ہیں، جسے موجودہ قانونی اصطلاح میں ''سیادت'' سے تعبیر کرتے ہیں، لہذا وہ علاقے جہاں اسلامی احکام کی حکمرانی ہے انہیں ''دار الاسلام'' کہا جائے گا، اور جہاں اسلامی احکام کی حکمرانی نہ ہو انہیں ''دار الحرب'' کہا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''سیادت'' کا مفہوم ریاست کے داخلی امور اور اپنے اقلیم پر اس کے دائرہ اختیار واثر کو بیان کرتا ہے، لیکن دنیا کو دو ''دار'' میں تقسیم کرنے کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے،

کیونکہ اس کے ذریعہ سے دوسرے کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کی تعیین کی جاتی ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ تعلقات کی نوعیت کی تعیین میں کسی متعین قانون کے غلبہ اور سیادت کو معیار نہیں بنایا جاتا ہے بلکہ اس کی بنیاد دوسرے اقلیم سے تعلقات کی نوعیت (یعنی جنگ یا صلح) پر ہوتی ہے۔ اس تقسیم کی بنیاد پر فقہاء نے دونوں ''دار'' سے متعلق بہت سے احکام مرتب کئے ہیں۔ دار الاسلام سے متعلق احکام تو بالکل واضح اور متعین ہیں، البتہ دار الحرب یا دار الکفر کے احکام کے تعلق سے فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس تقسیم کے اثرات:

فقہاء نے اس تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل پر بحث وتحقیق کی اور ان کے احکام کو جاننے کے لئے اجتہاد کیا۔ چند مسائل اور ان کے احکام کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱ — مالیاتی معاملات:

بعض فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ ''دار الحرب میں مسلمان اور حربی کے درمیان سود جائز نہیں ہے''(۲۸)۔

علامہ سرخسی لکھتے ہیں : ''دارلحرب میں مسلمان اور اہل حرب کے درمیان سود جائز نہیں ہے''(۲۹)۔

امام طبری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ ''اگر کوئی مسلمان کسی دار الحرب میں داخل ہوتا ہے تو وہ ان سے دو درہم کے عوض ایک درہم فروخت کرسکتا ہے۔ وہ ان سے خنزیر، مردار اور شراب بھی بیچ سکتا ہے اور ان سے سود لے سکتا ہے۔ وہ ان سے چاندی کے عوض چاندی اور سونے کے عوض سونا بھی بیچ سکتا ہے۔ وہ ہر وہ طریقہ اپنا سکتا

ہے جس سے اصلاً اسے منع کیا گیا ہے۔ وہ دو یا دو سے زیادہ کے عوض ایک چیز کو بیچ سکتا ہے، خواہ وہ خرید و فروخت نقداً ہو یا بشکل ادھار''۔

احناف کا کہنا ہے کہ ''اگر کوئی مسلمان کسی دار الحرب میں داخل ہوتا ہے اور وہ کسی سے دو درہم کے عوض ایک ہی درہم فروخت کرتا ہے تو ایسا کرنا اس کے لئے جائز ہے''۔ البتہ امام یوسف نے احناف کے ان تمام اقوال سے اختلاف کرتے ہوئے ان باتوں کو جائز قرار نہیں دیا ہے(۳۰)۔

ابن نجیم نے بعض احناف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں امان کے ساتھ داخل ہوتا ہے، اور وہ کسی حربی کا مال اس کی خواہش نہ ہونے کے باوجود اس سے لے لیتا ہے اور پھر وہ اسے نکال کر دار الاسلام لے آتا ہے کہ تو وہ اس مال کا مالک ہو جائے گا''(۳۱)۔

مالکی عالم ابن قاسم لکھتے ہیں : ''اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں داخل ہوتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اہل حرب کے مال چرا لے۔۔۔''(۳۲)۔

بعض فقہاء کا خیال ہے کہ ''دار الحرب کا مال و دولت مباح ہے''(۳۳)۔

اسی طرح بعض فقہاء کہتے ہیں کہ ''دشمن کی سرزمین پر لوٹ کھسوٹ مباح ہے، البتہ دار الاسلام میں لوٹ کھسوٹ جائز نہیں ہے''(۳۴)۔

علامہ جصاص لکھتے ہیں : ''صحیح املاک وہ ہیں جو دار الاسلام میں موجود ہوں۔ وہ املاک جو دار الحرب میں ہوں ان کی ملکیت صحیح نہیں ہوتی، کیونکہ دار الحرب درحقیقت ''دار اباحت'' ہے۔ لہذا وہاں کے باشندوں کی املاک مباح ہیں''(۳۵)۔

علامہ رافعی کا خیال ہے کہ ''دار الحرب میں اگر مسلمان اہل حرب کا مال چرا لیتے ہیں تو وہ ان کی ملکیت ہو جائے گا، کیونکہ حربی کا مال معصوم نہیں ہے، گویا کہ وہ مال مملوکہ ہی نہیں ہے

اوراس پر قبضہ کرناایساہی ہے جیسے مباح مال پر قبضہ کرنا‘‘(۳۶)۔

امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک دارالکفر میں سود حرام نہیں ہے(۳۷)۔

لیکن جمہور فقہاء(بشمول امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ) کے نزدیک مسلمان ومسلمان اور مسلمان وکافر کے درمیان سود کالین دین دارالاسلام، دارالکفر اور دارالحرب ہر جگہ حرام ہے۔

امام شافعی لکھتے ہیں : ’’اگر مسلمان کسی دارالحرب میں بطور قیدی، پناہ گزیں یا قاصد سکونت پذیر ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا قتل کردے یا اس پر تہمت لگائے یا کسی مسلم خاتون سے زنا کرلے تو ان تمام مسائل میں ان پر حکم اسی طرح لاگو کئے جائیں گے جس طرح دارالاسلام میں کئے جاتے ہیں۔ دارالحرب میں سکونت اختیار کرنا ان سے ان فرائض کو ساقط نہیں کرتا، جیسا کہ ان سے نماز، روزہ اور زکوۃ ساقط نہیں ہوتے۔ لہذا حدود ان پر فرض ہیں‘‘(۳۸)۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں : ’’دارالحرب میں سود اسی طرح حرام ہے جس طرح دارالاسلام میں۔ یہی کہنا ہے امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ اور امام اسحاقؒ کا‘‘(۳۹)۔

امام احمد اور امام اوزاعی کا کہنا ہے کہ دار الحرب کے باشندوں کا مال ناجائز طریقوں سے حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان دارالحرب کے کسی باشندہ کے مال پر ناجائز طریقہ سے قابض ہوجاتا ہے تو اس کے تعلق سے امام اوزاعی کہتے ہیں : ’’مسلمان بدعہد وغدار نہیں ہوتا، دارالحرب کے جن باشندوں کا مال کسی مسلمان نے لے لیا ہے انہیں وہ سارامال واپس کیا جائے گا‘‘(۴۰)۔

ابن منذر لکھتے ہیں : ’’اگر ایک مسلمان کسی دارالحرب میں امان کے ذریعہ داخل

ہوتا ہے تو وہ ان کے امان کے ذریعہ محفوظ ہے، اور وہ لوگ بھی اس کی جانب سے محفوظ ہیں، مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے ساتھ غداری یا خیانت کرے یا ان پر حملہ کرے۔ اگر وہ ان کی کوئی بھی چیز لے لیتا ہے تو اسے اس چیز کو انہیں واپس کرنا چاہئے۔ اور اگر کوئی چیز ان کے پاس سے لے کر دارالاسلام میں آجاتا ہے تو وہ سامان دارالحرب واپس کرنا واجب ہے، کسی بھی مسلمان کے لئے وہ سامان خریدنا یا اسے ضائع کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس مال کو امان حاصل ہے''(۴۱)۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''اگر کوئی مسلمان کسی حربی کے ساتھ خیانت کرتا ہے یا اس کا کوئی سامان چرالیتا ہے یا اس سے قرض لیتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ان چیزوں کو ان کے مالک کو واپس کرے۔ اگر ان سامانوں کے مالکین دارالاسلام آتے ہیں خواہ امان کے ساتھ یا اسلام قبول کر کے، تو وہ ان سامانوں کو انہیں واپس کرے گا۔ اور اگر وہ دارالاسلام نہیں آتے ہیں تو ان سامانوں کو ان کے پاس دارالحرب بھجوایا جائے گا، کیونکہ مسلمان نے انہیں ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہے۔ لہذا اس پر ان چیزوں کا واپس کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ ایک مسلمان کے سامان کو واپس کرنا ضروری ہے''(۴۲)۔

۲۔ قتل وخون کے احکام:

بعض فقہاء کا یہ خیال ہے کہ دارالحرب میں غیر مسلموں کا خون مباح ہے، علامہ سرخسی لکھتے ہیں: ''دارالحرب میں حربی مسلمانوں کے لئے میت کی طرح ہے''(۴۳)۔

امام طبری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ ''اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں شراب پیتا ہے یا زنا کرتا ہے اور پھر دارالاسلام آنے کے بعد اسے ہمارے پاس لایا جاتا ہے تو اس پر حد قائم نہیں کی جائے گی''(۴۴)۔

امام قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اگر مسلمان کی کسی کافر سے مڈبھیڑ ہوجائے اور

اس کافر کا کوئی معاہدہ نہ ہوتو اسے قتل کرنا جائز ہے"(۴۵)۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں : "محارب کفار کے جان ومال مسلمانوں کے لئے مباح ہیں"(۴۶)۔

علامہ ابن تیمیہ مزید لکھتے ہیں : "۔۔۔اسی لئے شریعت نے کفار سے جنگ اور قتال کو واجب قرار دیا ہے، البتہ ان میں سے جو زیر نگیں ہوجائیں ان کے قتل کو واجب قرار نہیں دیا ہے۔ لہذا اگر جنگ میں کوئی کافر قید ہوجاتا ہے یا کسی اور طریقہ سے مسلمانوں کی قید میں آجاتا ہے مثلاً کسی کافر کی کشتی اسے مسلمانوں کے درمیان پہنچادے یا کوئی کافر مسافر راہ بھٹک کر مسلمانوں کے پاس آجائے تو امام کو اس کے سلسلہ میں مناسب فیصلہ لینے کا اختیار حاصل ہے، چاہے تو اسے قتل کردے یا غلام بنالے، یا اس پر احسان کرے اور اس سے مال یا نفس کا فدیہ لے کر اسے چھوڑ دے۔ اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے، جیسا کہ قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے(۴۷)۔

۳— حدود کا نفاذ:

بعض مالکی فقہاء کا خیال ہے کہ دار الحرب میں حدود قائم نہیں کئے جائیں گے۔ امام اشہب کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس پر حد قائم نہیں کی جائے گی، کیونکہ یہ شبہ کے دائرہ میں آتا ہے،۔۔۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان دار الحرب میں جنگ کرے اور ڈاکہ ڈالے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اس کا ارتکاب کسی مسلم یا ذمی کے ساتھ نہ کرے"(۴۸)۔

احناف کا بھی یہی خیال ہے کہ دار الحرب میں زنا اور چوری کی حد قائم نہیں کی جائے گی۔ علامہ کاسانی لکھتے ہیں : "اگر کوئی شخص دار الحرب یا دار البغی میں زنا کرتا ہے اور پھر وہ ہمارے پاس دار الاسلام میں آتا ہے تو اس پر حد قائم نہیں کی جائے گی، کیونکہ جس وقت زنا کا وجود ہوا تھا

اس وقت وہ حد کے واجب ہونے کا سبب نہیں ہوسکا تھا، کیونکہ اس وقت اس پر کسی کو ولایت حاصل نہیں تھی‘‘(۴۹)۔

علامہ جصاص لکھتے ہیں : ’’دارالحرب میں مقیم کافر شخص کا قتل مباح ہے‘‘(۵۰)۔

۴ــ دارالحرب میں رہائش :

دارالحرب میں رہائش اختیار کرنے کے حکم کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ زیادہ تر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا واجب ہے(۵۱)۔

علامہ جصاص نے حسن بن صالح کا قول نقل کیا ہے کہ ’’اگر کوئی حربی اسلام قبول کرتا ہے اور پھر دارالحرب میں ہی رہائش اختیار کرلیتا ہے حالانکہ وہ وہاں سے نکلنے پر قادر ہو تو وہ مسلمان نہیں ہے‘‘ (۵۲)۔

بلکہ بعض متاخر علماء کا یہ کہنا ہے کہ جس ملک میں انسان کے وضع کردہ قانون کی حکمرانی ہو وہاں سے بھی ہجرت کرنا واجب ہے۔

شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ لکھتے ہیں : ’’جس ملک میں انسان کے وضع کردہ قانون کی حکمرانی ہو وہ اسلامی ملک نہیں ہے۔ وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کسی ملک میں بت پرستی عام ہوجائے ، اور اس پر کوئی نکیر نہ کرے اور نہ ہی اس میں تبدیلی لائی جاسکے تو وہاں سے بھی ہجرت کرنا واجب ہے، کیونکہ کفر سے کفر پھیلتا ہے، ایسا ملک کافرانہ ملکیت ہوگا‘‘(۵۳)۔

ان آراء کو پیش کرنے کے بعد ذیل میں ہم ’’تقسیم دار‘‘ کے نظریہ پر مختلف معیاروں کی روشنی میں بحث ومناقشہ کریں گے:

ا—اسلام کا پیغام:

اسلام تمام انسانوں کا دین ہے۔ اس میں رنگ، نسل، زبان، تہذیب وثقافت اور جغرافیائی محل وقوع کی بنیاد پر کسی طرح کی تفریق نہیں پائی جاتی۔ بہت سارے شرعی نصوص اس جانب اشارہ کرتے ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے :"**قل یا أیها الناس إنی رسول الله إلیکم جمیعا**" (۵۴)۔ ایک دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے :"**وما أرسلناک إلا کافة للناس بشیرا ونذیرا ولکن أکثر الناس لا یعلمون**" (۵۵)۔ سورہ انبیاء میں اللہ کا ارشاد ہے : "**وما أرسلناک إلا رحمة للعالمین**" (۵۶)۔

قرآن کریم کے انداز خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام سبھی کے لئے عام ہے۔ اللہ تعالی نے بے شمار آیات میں انسانوں کو "اے لوگو" اور "اے آدم کی اولاد" کہہ کر مخاطب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام سبھی کے لئے عام ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں :"**یا أیها الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون**" (۵۷)۔ ایک دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے :"**إن هو إلا ذکر للعالمین**" (۵۸)۔

علامہ الزجاج لکھتے ہیں : "العالمین کے مفہوم میں تمام وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں اللہ نے پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے :"**وهو رب کل شیئ**۔ وہ تمام عالم کا جامع ہے" (۵۹)۔

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے تمام انبیاء کی اخوت کو بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مخلوق کی ہدایت ورہنمائی کے لئے تمام انبیاء کا منہج ایک ہی تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دنیا اور آخرت میں حضرت عیسی بن مریمؑ کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں۔ تمام انبیاء ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ان کی مائیں مختلف تھیں، لیکن ان کا دین ایک تھا (۶۰)۔

اس طرح ہر انسان کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس پیغام کو قبول کرے۔ جو شخص ایمان لے آئے اور دین اسلام میں داخل ہو جائے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ جو ایک مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں اور اس پر وہ تمام فرائض عائد ہوں گے جو ایک مسلمان پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے دین پر ہی قائم رہنا چاہتا ہے تو اسے اس کا اختیار حاصل ہے، اسلام قبول کرنے کے لئے اس پر کسی طرح کی زبردستی نہیں کی جائے گی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "لا إکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" (٦٠)۔ ایک دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے: "أفأنت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین" (٦١)۔

اسلامی پیغام کے مقاصد عالمگیر ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ پیغام تمام لوگوں تک پہنچایا جائے، اس پیغام کے مقاصد کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو "مسلمان" اور "محارب" کے درمیان علی الاطلاق تقسیم کر دیا جائے۔ لہذا جو شخص اسلحہ اٹھاتا ہے اور مسلمانوں سے جنگ کرتا ہے تو اس پر محارب کا حکم لاگو کیا جائے گا، اور جو اسلحہ نہیں اٹھاتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں سے جنگ کرتا ہے وہ اسلام کی عالمگیریت کے سایہ میں آئے گا اور وہ اس پیغام کا مخاطب اور رحمت کا مستحق ہوگا۔ اسلام اس شخص کا دین ہے جو اس پر ایمان لے آئے اور تمام لوگوں کے لئے رحمت ہے، اور رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتے ہوئے صرف ان لوگوں کو سزا دی جائے جو مسلمانوں کی مخالفت کریں اور ان سے جنگ کریں، اور جو لوگ ایسا نہ کریں ان لوگوں کی حفاظت کی جائے اور ان کے ساتھ رحم کا معاملہ کیا جائے، گرچہ وہ غیر مسلموں کے دیار ہی میں کیوں نہ ہوں، اللہ تعالی فرماتے ہیں: "ورحمتی وسعت کل شیئ" (٦٢)۔

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اللہ تعالی رحمت کا معاملہ اسی شخص کے ساتھ کرتا ہے جو خود رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ صحابہ کرام نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ، ہم میں سے ہر شخص رحم کا معاملہ کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ کا رحم ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم میں سے ایک شخص دوسرے پر کرتا ہے، بلکہ اس کا رحم تمام لوگوں پر عام ہے'' (٦٣)۔

نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ''تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا'' (٦٤)۔

ایک اور موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ تعالی اس پر رحم نہیں کرتا'' (٦٥)۔

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالی نے رحمت کے سو حصے کئے، ننانوے حصے اس نے اپنے پاس روک لئے اور صرف ایک حصہ زمین پر نازل کیا، اسی ایک حصہ کا یہ اثر ہے کہ تم مخلوقات میں باہم رحم کا مشاہدہ کرتے ہو، اسی کے نتیجہ کے طور پر تم دیکھتے ہو کہ جانور اپنے بچہ سے اپنا کُھر اس اندیشہ سے دور رکھتا ہے کہ مبادا اس کے بچہ کو تکلیف نہ پہنچ جائے'' (٦٦)۔

اس طرح تمام انسانیت اسلام کی عالمگیریت اور اس کے رحمت میں شامل ہے، لہذا اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا ہے تو وہ دشمن نہیں ہوجاتا اور نہ ہی اس کا خون مباح ہوتا ہے۔ فقہاء کے یہاں یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ''**كفر الكافر لا يبيح دمه**'' یعنی صرف کفر کے سبب ایک غیر مسلم شخص کا خون مباح نہیں ہوجاتا۔ اسی طرح صرف جنگ سے ان غیر مسلمین کا خون مباح نہیں ہوجاتا جو اپنے دیار میں ہوں، گرچہ ان کا ملک مسلمانوں سے جنگ ہی کیوں نہ کررہا ہو۔ خصوصاً اس زمانہ میں تو جنگ کے اصول اور طریقے بدل گئے ہیں، اب وہ صورت حال نہیں ہے جو پہلے تھی جب تمام مکلف مردوں کو جنگ میں شریک ہونے کے لئے کہا جاتا تھا، کیونکہ اس وقت جنگ اور دفاع کے لئے علاحدہ سے مختص فوجیں نہیں ہوا کرتی تھیں، جبکہ موجودہ دور میں اس کام کے لئے علاحدہ سے فوجیں ہوا کرتی ہیں۔ لہذا اگر غیر اسلامی مملکت کے تمام افراد

کومحارب قرار دے دیا جائے تو اس سے ان کے خون اور عزت وآبرو کی حفاظت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ حالانکہ ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ غیر اسلامی مملکت کے بہت سارے افراد اپنے ملک کی ان جنگی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتے ہیں جو کسی اسلامی یا غیر اسلامی مملکت سے متعلق ہوتی ہیں۔غیر اسلامی مما لک کی بہت ساری تنظیمیں اور ادارے ان جنگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو ان کا ملک کسی دوسرے ملک کے خلاف کرتا ہے۔ اکثر وبیشتر یہ بات ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے کہ جنگ مسلط کرنے والے ملکوں کے افراد اپنے ہی ملک کی جنگی پالیسیوں کے خلاف مظاہرات کرتے ہیں، دھرنے دیتے ہیں، پارلیمنٹ میں حکومت سے اس سلسلہ میں بحث ومناقشہ کرتے ہیں اور میڈیا کے ذریعہ اپنے ان سیاسی قائدین کی مخالفت کرتے ہیں جو دوسرے ملکوں پر جنگ مسلط کرتے ہیں۔ بلکہ بسااوقات یہ لوگ جنگ سے متاثر ملکوں میں وفود بھیجتے ہیں اور امدادی قافلے روانہ کرتے ہیں۔ لہذا یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ بھی محارب ہیں، ان پر صرف اس وجہ سے محارب کا حکم کیسے نافذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی حکومت نے کسی مسلم مملکت کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بعض مسلمان اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے، لہذا انہوں نے بہت سے غیر مسلموں کو اغوا کرلیا یا قتل کر دیا، صرف اس وجہ سے کہ ان کے ملک نے جنگ کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے ملک میں دھماکے کر کے ایسے بے گناہ غیر مسلموں کو نشانہ بنایا جنہوں نے درحقیقت خود کوئی جنگ نہیں کی تھی اور نہ ہی مسلمانوں کے خلاف اسلحہ اٹھایا تھا۔

اسلام پوری دنیا کے لئے رحمت بن کر آیا ہے، اسلام اس لئے نہیں آیا کہ لوگوں کے خون کی ہولی کھیلی جائے اور ان کے مال ودولت کو ہڑپ لیا جائے، البتہ اگر قوانین وضوابط کی روشنی میں کسی کا قتل مشروع قرار پاتا ہے تو وہ ایک علاحدہ بات ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا وہ قول جسے ذہبی نے سیر أعلام النبلاء میں نقل کیا ہے نہایت اہمیت کا حامل ہے :

''مصر کے گورنر حیوۃ بن شریح نے حضرت عمر بن عبد العزیز کو لکھ بھیجا کہ ذمیوں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور جزیہ دینا بند کر دیا ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا: اللہ تعالی نے نبی کریم ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصل بنا کر، جب تمہارے پاس میرا خط پہنچے اور ذمیوں نے اسلام قبول کرلیا ہو اور جزیہ دینا بند کر دیا ہو تو تم اسے قبول کرلو'' (٦٧)۔

۲ — اسلامی سیاسی فقہ:

اختلاف دارین کی بحث شرعی سیاست سے متعلق مباحث کا حصہ ہے، اسے جدید دور میں ''اسلامی سیاسی فقہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ فقہ عقائد، عبادات اور معاملات کی طرح تفصیلی نصی احکام پر مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کے عمومی قواعد پر مبنی ہے۔ یہ بات درحقیقت اسلامی شریعت کی وسعت اور لچک کی علامت ہے، کیونکہ سیاست ہر معاشرہ میں نہایت تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ فقہ اسلامی کی یہ خصوصیت اور امتیاز ہے کہ اس نے اسلامی شریعت کے بنیادی مآخذ (یعنی قرآن وسنت) کی روشنی میں ایسے قواعد وضع کر دیئے ہیں جن کی مدد سے تفصیلی احکام کا استنباط ممکن ہے۔ زمانۂ قدیم میں مسلمان فقہاء نے یہی کام کیا تھا۔ انہوں نے ان قواعد کی روشنی میں اپنے زمانہ کے لئے اجتہاد کیا اور مسلمانوں وغیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت وکیفیت کے بارے میں تفصیل بیان کی۔ اس زمانہ کے فقہاء کے اجتہادات کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک فقہی اجتہاد ہے جو مسلمانوں وغیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے گرد کیا گیا تھا۔ یہ اجتہادات معاصر فقہاء اور علم قانون کے ماہرین کے ان اجتہادات سے بہت مشابہ ہیں جو انہوں نے بین الاقوامی تعلقات سے متعلق احکام وضوابط کے گرد کیا تھا۔ تقسیم دار کا مسئلہ درحقیقت ''اسلامی سیاسی فقہ'' کے ذیل میں آتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس سلسلہ میں ازسرنو اجتہاد کیا جائے تا کہ اس موضوع سے متعلق ایسے جدید فقہی احکام تک رسائی حاصل کی جاسکے جو اسلام کے عمومی قواعد وضوابط سے مطابقت

رکھتے ہوں، اور جن کے سلسلہ میں سابق فقہاء کے اجتہادات سے بھی رہنمائی حاصل کی جائے اور ایک ایسا جدید اسلامی فقہ سامنے آئے جس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت وکیفیت سے بحث کی گئی ہو۔

۳۔ تقسیم کا تاریخی پس منظر:

تقسیم دار کے مسئلہ کا تعلق شرعی نصوص سے زیادہ تاریخی پس منظر اور تاریخی مراحل وزمانہ سے ہے۔ اگر یہ تقسیم شرعی نصوص سے قطعی طور پر ثابت ہوتی تو اس سلسلہ میں کچھ بھی اختلاف نہ پایا جاتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کوئی بھی ایسی واضح اور صریح نص نہیں پائی جاتی جس سے معلوم ہو کہ دنیا کی یہ تقسیم شریعت کی بیان کردہ ہے۔ وہ تمام آیات واحادیث جن سے اس تقسیم کی اصالت کے قائلین استدلال کرتے ہیں، درحقیقت اپنی دلالت میں قطعی نہیں ہیں۔ یہ شرعی نصوص یا تو عمومی مسائل کی جانب اشارہ کرتے ہیں یا پھر انہیں متعدد معانی ومفاہیم پر محمول کیا جاسکتا ہے، جن میں سے ایک معنی ''دو دار میں دنیا کی تقسیم'' ہے۔ اور بلاشبہ اس طرح کے نازک اور اہم مسائل جن کی وجہ سے جنگیں ہوجاتی ہیں، خون وغارت گری ہوجاتی ہے اور مسلمانوں وغیر مسلموں کے تعلقات متاثر ہوتے ہیں، میں صرف فہم یا استنتاج یا اجتہاد پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ یہ تقسیم عملی طور پر مستحکم نہیں ہوئی ہے اور اس کی نوعیت وکیفیت کے سلسلہ میں فقہاء کا اتفاق بھی نہیں ہے۔ آپ نے گزشتہ صفحات میں دیکھا کہ اس کی تعریف کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، وہ اس تقسیم کی نوعیت اور اس کے مکونات وعناصر کے سلسلہ میں بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ چند فقہاء کے یہاں دنیا کی دو قسمیں ہیں، تو چند دیگر فقہاء کے یہاں اس کی تین قسمیں (دارالاسلام، دار الحرب، اور دار العہد)، بلکہ بسا اوقات بعض فقہاء نے ان تمام تقسیمات کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دنیا تو ایک تنہا وحدت ہے، حنفی فقیہ ابوزید الدبوسی کہتے ہیں: ''ہمارے یہاں

اصل یہ ہے کہ دنیا دو دار میں منقسم ہے، دارالاسلام اور دارالحرب۔ البتہ امام شافعی کا یہ کہنا ہے کہ دنیا صرف ایک ہی دار ہے'' (٦٨)۔

قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں اصل چیز ''وحدت'' ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کا قصہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: **''وقال موسی لقومه استعينوا بالله واصبروا إن الأرض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين''** (٦٩)۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **''والأرض وضعها للأنام فيها فاكهة والنخل ذات الأكمام''** (٧٠)۔ اس سلسلہ کی چند اور آیات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

''قد خلت من قبلكم سنن فسيروا فی الأرض فانظروا كيف كان عاقبة المكذبين'' (٧١)۔

''هو الذی جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا فی مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور'' (٧٢)۔

''قل يا عباد الذين آمنوا اتقوا ربكم للذين أحسنوا فی هذه الدنيا حسنة وأرض الله واسعة إنما يوفی الصابرون أجرهم بغير حساب'' (٧٣)۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''تمام ملک اللہ کے ملک ہیں اور تمام بندے اللہ کے بندے ہیں، لہٰذا جہاں کہیں تمہیں خیر حاصل ہو جائے وہیں قیام کرلو'' (٧٤)۔

ان آیات اور دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمام انسانوں کے لئے بنایا ہے، لہٰذا زمین کی جو بھی تقسیم کی جائے گی وہ ایک وقتی تقسیم ہوگی۔

اگر موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو تقسیم کا تعلق سیادت سے ہے، اسی طرح اس کا تعلق امن کے مفہوم سے بھی ہے جو امن ایک مسلمان یا غیر مسلم کو کسی ایک دار میں حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض مالکی فقہاء کا یہ خیال ہے کہ ''دارالاسلام سے مراد وہ جگہ ہے جہاں دشمن کا

خوف نہ ہو، اور دار الحرب سے مراد وہ جگہ ہے جہاں دشمن کا خوف ہو، خوہ وہ دار الکفر ہو یا دار الاسلام ہو'' (۷۵)۔ مالکی عالم العدوی لکھتے ہیں : ''دار الحرب سے مراد وہ جگہ ہے جہاں فوج قیام کرے خواہ وہ دار الاسلام ہی میں کیوں نہ ہو جہاں کوئی امن نہ ہو'' (۷۶)۔

بلکہ احناف جنہوں نے اس تقسیم کو نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے انہوں نے بھی یہ بات نہیں کہی ہے کہ اس تقسیم کا بنیادی محور حالت جنگ ہے۔ شیخ مصطفی الزرقا لکھتے ہیں : ''احناف کے یہاں دار الحرب سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہاں کے باشندوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی ہو، بلکہ دار الحرب سے مراد غیر اسلامی ملک اور علاقہ ہے جو اسلام کی سلطنت وحکمرانی میں نہ آتا ہو'' (۷۷)۔

بعض متاخر فقہاء (مثلاً عبد القادر عودہ) کا کہنا ہے کہ ''دار الاسلام میں وہ تمام ممالک شامل ہیں جہاں اسلامی احکام ظاہر ہوں یا جہاں مسلمان اس پوزیشن میں ہوں کہ وہ اسلامی احکام کو ظاہر کرسکیں اور ان پر عمل کرسکیں۔ لہذا دار الاسلام میں ہر وہ ملک شامل ہے جس کی تمام آبادی یا غالب اکثریت مسلمان ہو۔ اسی طرح ہر وہ ملک جس پر مسلمان قابض ہوں اور اس پر حکمرانی کر رہے ہوں وہ بھی دار الاسلام میں شامل ہے، گرچہ اس ملک کی غالب اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ دار الاسلام میں وہ ملک بھی شامل ہے جس کی حکمرانی غیر مسلموں کو حاصل ہو، لیکن وہاں مسلمان رہائش پذیر ہوں اور وہ اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوں اور انہیں علی الاعلان کر سکتے ہوں، اور کوئی بھی ایسا مانع نہ ہو جو انہیں اسلامی احکام کے علی الاعلان اظہار سے باز رکھتا ہو'' (۷۸)۔

متعدد فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ قرآن وحدیث میں اس تقسیم کی کوئی دلیل نہیں ملتی، بلکہ یہ تقسیم درحقیقت ان تاریخی حالات کے پس منظر میں کی گئی ہے جو پہلے دور کے مسلمانوں نے برتے تھے، وہ حالات جن سے اس دور کے مسلمان اور ان کی حکومتیں گزر رہی تھیں اور جن جنگوں

کا سامنا ان حکومتوں کو تھا ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس دور میں دنیا کی دو تقسیم کی گئی تھی: دارالاسلام اور دارالحرب (۷۹)۔

پھر فقہاء نے دنیا کی دو تقسیم سے تجاوز کرتے ہوئے اس کی تین قسمیں بیان کیں: دارالاسلام، دارالحرب، اور دارالعہد۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگر دو دار میں دنیا کی تقسیم لازمی امر ہوتا تو فقہاء نے دو سے تجاوز کر کے دنیا کی تین قسمیں نہ بیان کی ہوتیں۔ یہاں پر ایک اور سوال ہمارے سامنے آتا ہے، کیا ان تین قسموں پر رک جانا اور توقف کرنا لازمی ہے؟ یا یہ ممکن ہے کہ اس میں مزید اجتہاد کیا جائے اور اس کے دیگر معانی ومفاہیم پر غور وفکر کیا جائے۔ بعض متاخرین فقہاء نے اس سلسلہ میں چند جدید قسمیں بیان کی ہیں، مثلاً **أمة الدعوة** اور **أمة الإجابة**۔ اس بات کے پیش نظر کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد دعوت ہے جس کی بنیاد اسلامی پیغام کی تبلیغ پر رکھی گئی ہے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان امن اور جنگ فطری تعلقات نہیں ہیں، بلکہ امن وجنگ تو زمانہ قدیم اور زمانہ جدید میں بین الاقوامی تعلقات کی دو منہج ہیں جن سے مسلمان بوقت ضرورت شرعی اصول وضوابط کی روشنی میں استفادہ کر لیتے ہیں۔

شیخ مالک بن نبی غیر مسلموں کے دیار (یا قدیم اصطلاح کے مطابق دارالحرب) کو "**دار الشهود**" (۸۰) کہتے ہیں، انہوں نے زندگی میں مسلمانوں کے مطلوبہ کردار کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نام رکھا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وكذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا**" (۸۱)۔

شہادت کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کا علم ہو اس کی خبر دی جائے تا کہ وہ حق قائم کیا جا سکے جس پر وہ خبر موقوف ہے۔ شہادت کا عمل چار بنیادی عناصر پر مبنی ہوتا ہے: وہ علم جو شہادت کی بنیاد ہے، اس علم کا اظہار، اس علم کی اس طرح سے تبلیغ کہ وہ دوسروں تک صحیح طریقہ سے

پہنچ سکے، اوران تمام امور میں عدل وانصاف سے کام لینا تاکہ اس شہادت کے ذریعہ مشہود علیہم کو نفع پہنچ سکے۔ دراصل یہی حقیقی شہادت علی الناس کا مفہوم ہے جس پر اسلامی تہذیب وثقافت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ دین کے مبادیات واصول میں بھی شہادت علی الناس کا یہ مفہوم ملے گا اور اسلامی تہذیب کی عملی سیرت میں بھی یہی مفہوم ملے گا۔ یہ ایک ایسی شہادت ہے جس کی بنیاد انسان کا اعتقادی تصور ہے، جس انسان کو نعمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جس نے تعظیماً اللہ کی امانت کا بوجھ اٹھالیا ہے۔ اسی بنیاد پر اسلامی تہذیب دین، کائنات اور انسانوں سے متعلق حقائق کے علم کی لوگوں پر شہادت دیتی ہے۔ پھر اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان حقائق کو لوگوں تک ایک خیرخواہ اور مصلح کی حیثیت سے پہنچادیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب شدت پسندانہ افکار وخیالات کے درمیان معتدل راہ اختیار کرنے اور عدل سے کام لینے کی شہادت دیتی ہے۔ ساتھ ہی اسلامی تہذیب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت مساوی معاملہ کرنے، ظالم کو مظلوم سے باز رکھنے اور کمزوروں ومظلوموں کی مدد کرنے کی شہادت دیتی ہے۔ یہ ہے درحقیقت اسلامی تہذیب وثقافت میں شہادت علی الناس کا مفہوم۔۔۔۔(۸۲)۔

دو یا دو سے زائد دار میں دنیا کی تقسیم کی روشنی میں اس تہذیبی شہادت کے مفہوم کو برتا نہیں جاسکتا ہے۔

بعض لوگوں نے دارالاسلام اور دارالحرب کی تقسیم کو جدید انداز میں پیش کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جدید دور میں بین الاقوامی تعلقات میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں، لہذا اس تقسیم میں اب سابقہ معیار کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ لوگ دارالاسلام کی اس طرح تقسیم کرتے ہیں: وہ جو حکماً اور حقیقتاً دارالاسلام ہو، اور وہ جو حکماً تو دارالاسلام ہو لیکن حقیقتاً نہ ہو۔ ان حضرات کے مطابق حقیقی دارالاسلام وہ ہے جس کا ذکر قدیم فقہاء کے یہاں ملتا ہے، اور جو حکماً دار الاسلام ہو نہ کہ حقیقتاً وہ ہے جس میں مسلمان سکونت پذیر ہوں، اپنے دینی شعائر پر عمل کرتے

ہوں، دین پر عمل کرنے کے سبب انہیں کسی طرح کے ظلم وزیادتی کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو، اور انہیں دیگر شہریوں کی طرح تمام شہری حقوق حاصل ہوں، لیکن وہاں اسلامی حکم نافذ نہ ہو۔ دار الحرب اس ملک وعلاقہ کو کہتے ہیں جس کے باشندوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہو رہی ہو، لیکن اس جنگ کے اثرات دار الحرب کے ان باشندوں تک ممتد نہیں ہوتے جو خود جنگ میں براہ راست یا بالواسطہ شریک نہ ہوں، بلکہ یہ اثرات صرف ان لوگوں تک محدود ہوتے ہیں جو جنگ میں عملی طور پر شریک ہوں (۸۳)۔

۴— بین الاقوامی تعلقات کے احوال میں تبدیلی:

مختلف ملکوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کے مختلف احوال اور حالات کے پیش نظر تقسیم دار کا مفہوم ظہور پذیر ہوا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ کی حالت ہی عام تھی۔ ظہور اسلام سے قبل بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد جنگ وجدال پر ہی قائم تھی، جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس وقت کی دوسب سے بڑی حکومتوں (یعنی فارس اور روم) کے درمیان جنگ قائم تھی، ان دونوں حکومتوں نے اسلام کی نئی حکومت وریاست کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خلاف جزیرۃ العرب کے مشرکین نے بھی جنگ چھیڑ دی، تاریخ کے اس مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات پر جنگ غالب رہی، اس دور میں ملکوں اور گروہوں کے درمیان جنگ وجدال ہی اصل تھا، اور پر امن تعلقات تو ایک استثنائی چیز تھی، لہذا مدینہ منورہ کی اسلامی حکومت وریاست کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ اپنے گرد موجود فوجی وعسکری چیلینجز کا مقابلہ کرے جو اسے فنا کرنے کے درپے تھے، لہذا مسلمان اپنے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے (جسے آج کی اصطلاح میں دفاعی جنگ کہا جاتا ہے) اور انہو ں نے اپنے خلاف سازش کرنے والوں پر حملہ بولا۔ ان حالات کے باوجود مسلمانوں کے غیر

مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت جنگی بھی تھی اور امن وصلح پر مبنی بھی۔ جس وقت مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان جنگیں ہو رہی تھیں اسی دوران نبی کریم ﷺ نے مختلف وفود اور سفراء کا استقبال کیا، اور اس طرح اسلام کے ابتدائی مرحلہ میں انسانوں کے درمیان پرامن تعلقات کے نظریہ کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس دور کے بین الاقوامی تعلقات کے ماحول نے عین وہی ماحول کو اختیار کرنے پر مسلمانوں کو مجبور کر دیا۔ عبداللہ بن بیہ لکھتے ہیں: "دار سے متعلق ان شرعی احکام نے اس تقسیم (دارالاسلام اور دارالحرب) کی بنیاد رکھی، لیکن اس کا تاریخی سبب یہ ہے کہ اس دور میں ملکوں وقبیلوں کے درمیان میں معاہدات نہیں ہوا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت ملکوں اور قبائل کے درمیان تعلقات یا تو دشمنی پر مبنی تھے یا جنگ پر یا غلبہ وتسلط پر۔ اس وقت اصل بات یہ تھی کہ ایک ملک دوسرے ملک پر غالب آجائے جیسا کہ روم اور فارس کے درمیان تھا، یا ایک ملک دوسرے ملک کے زیرنگیں آجائے۔ اس وقت سلطنتوں کے دلوں میں وسعت نہیں تھی، اس وقت صرف جنگ اور غلبہ کی حکمرانی تھی جس میں ایک غالب ہوتا تھا اور دوسرا مغلوب۔ یہ صورتحال قبائل کے ساتھ بھی تھی اور بڑی بڑی سلطنتوں مثلاً فارس وروم کے ساتھ بھی تھی (۸۴)۔

اُس وقت مختلف انسانی گروہوں اور ملکوں کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت اور صورتحال تھی، اسلام نے ان تعلقات اور ان سے متعلق احکام کے سلسلہ میں خود کو ممتاز رکھا۔ تمام مسلمان ایک ہی علاقہ میں رہا کرتے تھے، حتیٰ کہ جب اسلامی ریاست میں وسعت آ گئی اور مسلمانوں کے زیرنگیں بہت سے علاقے آ گئے تب بھی وہ ایک سیاسی وحدت کے ذریعہ باہم مربوط رہے جس پر شریعت کی حکمرانی تھی۔ گرچہ بسا اوقات اس سیاسی وحدت میں کمزوری بھی در آئی لیکن دارالاسلام کا مفہوم بالکل واضح اور متعین رہا۔ علاوہ ازیں جغرافیائی وحدت نے دار الاسلام کے لئے ایک عملی اطار فراہم کیا۔ ان حالات اور ماحول کے تحت تقسیم دار کا نظریہ سامنے

آیا۔ بین الاقوامی تعلقات کے ان حالات کو منظم کرنے کی خاطر مسلم فقہاء کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اجتہاد کرتے۔ معلوم ہوا کہ تقسیم دار کے نظریہ کا تعلق ثابت شدہ نصوص سے زیادہ بین الاقوامی تعلقات کے ماحول وحالات سے ہے۔

گزشتہ زمانوں کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے احوال بہت بدل چکے ہیں، آج کے بین الاقوامی تعلقات کے احوال اس دور کے احوال سے بہت بدل گئے ہیں جب تقسیم دار کا نظریہ وجود میں آیا تھا اور دنیا کی دو قسمیں یعنی دار الاسلام اور دار الحرب وجود میں آئی تھیں۔ موجودہ دور میں (خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ اور بین الاقوامی امن وسلامتی کی حفاظت کی خاطر بین الاقوامی تنظیموں کے وجود میں آنے کے بعد) انسانوں کے درمیان حالت صلح ہی اصل وبنیادی حالت ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ دور میں بین الاقوامی معاہدات کا وجود سامنے آیا ہے جن پر دنیا کے تمام ملکوں کا اتفاق ہے۔ موجودہ دور میں مسلم ملکوں میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے بلکہ دوسرے ادیان کے متبعین بھی بطور شہری رہتے ہیں، اسی طرح اب مسلمان بھی صرف مسلم ملکوں ہی میں نہیں رہتے، بلکہ وہ مختلف ملکوں میں پھیل چکے ہیں، بعض غیر اسلامی ملکوں میں تو مسلمانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے، مسلمانوں نے غیر اسلامی ممالک کی جانب ہجرت مختلف اغراض ومقاصد کے تحت کی ہے۔ بعض نے دعوت اسلامی کی خاطر ہجرت کی ہے تو بعض نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے، جبکہ کسی نے علاج ومعالجہ کی غرض سے ہجرت کی ہے۔ کسی نے تجارت کرنے کی خاطر ہجرت کی ہے تو کسی نے تبدیلئ وطن کی خاطر، جبکہ ایسے بھی افراد ہیں جنہوں نے اپنے مسلم ملک کے ظلم وجبر سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہجرت کی ہے۔ بعض غیر اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی تعداد بعض اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے، مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵۰ ملین سے بھی زیادہ ہے، چین میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۵۰ ملین ہے۔ روس میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰ ملین سے زائد، امریکہ میں ۸ ملین

سے زائد اور یوروپ میں تقریباً ۴۴ ملین ہے (۸۵)۔

کیا ان مسلمانوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دراصل دارالحرب میں مقیم ہیں!!، ان ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کریں یا وہ دارالکفر کو دارالاسلام میں بدلنے کی کوشش کریں، خواہ انہیں اس کے لئے اپنے ہم وطن لوگوں سے جنگ کرنی پڑے، جیسا کہ بعض قدیم فقہاء اور بعض جدید مسلم محققین کی رائے ہے۔ مغنی المحتاج میں تحریر ہے: ''اگر وہ دارالحرب میں اپنی حفاظت کے ساتھ رہنے پر قادر ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہیں قیام کرے، کیونکہ وہ جس جگہ پر مقیم ہے وہ دارالاسلام ہے، اگر وہ وہاں سے ہجرت کرتا ہے تو وہ دارالحرب ہوجائے گا، ۔۔۔۔ البتہ اگر وہ ہجرت کر کے مسلمانوں کی مدد کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ ہجرت کر لے۔ ماوردی کا کہنا ہے: دارالحرب میں اپنے قیام کے دوران مسلمان اسلام کی خاطر حربیوں سے قتال کرے گا اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دے گا، بشرطیکہ وہ اس پر قادر ہو، اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اس پر یہ کام ضروری نہیں ہے'' (۸۶)۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ایک مسلمان دارالکفر میں اپنے دین کے اظہار اور مطلوبہ شرعی احکام پر عمل کرنے پر قادر ہو اور وہ دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرسکتا ہو تو اس کے لئے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا حرام ہے، خواہ وہ تنہا یہ کام کرسکتا ہو یا اپنے ملک کے کسی مسلم گروہ کی مدد سے یا اپنے ملک کے علاوہ دیگر کسی ملک کے مسلمانوں کی مدد سے یا اسلامی ملکوں کی مدد سے یا کسی اور ذریعہ سے یہ کام کرسکتا ہو، ان تمام صورتوں میں اس پر واجب ہے کہ وہ دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے، اس کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا حرام ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس ملک میں مسلمان رہ رہا ہو اور وہاں کفار بھی رہتے ہوں اور وہاں کفر ہی کی حکمرانی ہو تو مسلمانوں کے لئے ان لوگوں سے جنگ

کرنا واجب ہے، حتی کہ وہ لوگ اسلام لے آئیں یا جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں اور اسلام کی حفاظت کرنے لگیں، ۔۔۔ اگر ایسا مسلمان دار الکفر سے نکلتا ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ ایسی جگہ سے بھاگ رہا ہے جہاں اس پر جہاد واجب ہے!!(۸۷)۔

اس طرح کی آراء مذکورہ بالا مسئلہ میں ماحول اور حالات کی تبدیلی کی کچھ بھی رعایت نہیں کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس رائے کے حاملین تاریخ کے کسی ایک مرحلہ میں اس سلسلہ میں اجتہادی احکام بیان کرتے ہیں اور اسے تمام زمانہ کے لئے ثابت اور غیر متبدل قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ بین الاقوامی تعلقات کے احوال میں تبدیلی کے سبب مختلف ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات کو نئی بنیادوں پر از سر نو بیان کیا جاتا رہا ہے، لہذا موجودہ دور میں بھی دار الاسلام اور دار الحرب کی تقسیم پر از سر نو غور کیا جاسکتا ہے، اس تقسیم پر از سر نو غور وفکر کو شرعی حکم کی خلاف ورزی نہیں سمجھنا چاہئے۔ بین الاقوامی ماحول وحالات میں تبدیلی کا یہ تقاضا ہے کہ اس مسئلہ پر منہجی انداز میں غور وفکر کیا جائے۔ بین الاقوامی ماحول ونظام میں تبدیلی کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ موجودہ حالات اور شرعی اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے اس سلسلہ میں جدید تقسیم پر بحث وتحقیق کی جائے۔ بلاشبہ نیشنلسٹ ملکوں کے ظہور اور عثمانی حکومت وخلافت کے سقوط کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اس سلسلہ میں نئی تقسیم پر گہرائی و گیرائی سے غور وفکر کیا جائے۔

کائنات کی بین الاقوامی تقسیم صرف حدود کی تقسیم ہی کا نام نہیں ہے، جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ تقسیم اس سے کہیں زیادہ عمیق اور وسیع ہے، حدود کی تقسیم سے متعلق نقطۂ نظر اس وسیع وعمیق تقسیم کا صرف ایک عنصر ہے۔ لہذا اس تقسیم پر از سر نو غور وفکر کرتے ہوئے جن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے وہ یہ ہیں: بین الاقوامی معاشی نظام، باہم اعتماد سے متعلق سرگرمیاں، جدید استعمار کے طریقے، غیر حکومتی بین الاقوامی تنظیمیں، حدود وقومی ریاست وسیادت کے مفہوم میں تبدیلی، کائناتی وعالمی نظریہ کی معاونت کے مفاہیم کا ظہور، مثلاً عالمی شہریت اور امن وسلامتی کی

خاطر تعلیم وغیرہ۔۔۔۔(۸۸)۔

۵۔عملی تطبیق:

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تقسیم دار کے نظریہ کو تاریخی تطبیقات کے ضمن میں رکھا جاتا جو تطبیقات تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار میں پیش کی گئیں، یا پھر اسے اجتہادی فقہی مباحث کے ضمن میں رکھا جاتا جن میں زمانہ اور حالات کی تبدیلیوں کے پیش نظر تجدید اور از سر نو غور وفکر کی ضرورت باقی رہتی ہے۔لیکن ابھی حالیہ چند دہائیوں میں کچھ ایسی عملی سرگرمیاں سامنے آئی ہیں جنہوں نے دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام کو ایسے زمانہ اور حالات پر منطبق کیا ہے جو اس زمانہ اور حالات سے بہت مختلف ہیں جو اس نظریہ کے وجود میں آنے کے وقت پائے جاتے تھے۔موجودہ زمانہ میں کچھ ایسے گروہ اور جماعتیں موجود ہیں جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتے ہیں، انہوں نے موجودہ زمانہ میں اس تقسیم کو اپنایا ہے اور اس کے احکام کو عملی طور پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے،لہذا انہوں نے غیر اسلامی ملکوں کو دارالحرب قرار دے دیا ہے اور وہاں کے باشندوں کے خون، جان ومال اور عزت وآبرو کو مباح قرار دیا ہے۔ بلکہ انہوں نے اس مسئلہ کو اسلامی ملکوں پر بھی منطبق کیا ہے، بایں طور کہ ان ممالک سے ''اسلام ختم ہوگیا'' ہے، یا یہ کہ ان پر ''کفر کی حکمرانی'' ہے،لہذا انہوں نے بعض مسلمانوں (مثلاً حکام، سیاست داں اور فوجیوں) کے خون کو مباح قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ لوگ ''ملت سے خارج'' یا ''کافر'' ہیں۔اس سلسلہ میں انہوں نے قدیم فقہاء کی آراء سے دلیل پیش کی ہے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ جن ممالک میں ان جیسے لوگ حکومت کررہے ہوں وہ دارالاسلام باقی نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ وقتی طور پر دارالکفر ہی کا ایک حصہ ہوجاتا ہے، یہ ممالک کسی زمانہ میں تو دارالاسلام تھے لیکن ان پر مرتدین قابض ہوگئے اور انہوں نے وہاں کافرانہ احکام نافذ کردیئے، مثلاً وہ ممالک جن کے نام کے ساتھ ''اسلامی'' لگا ہوا ہے، اور ان میں سرفہرست

عرب مما لک ہیں، جب ان مما لک پر مسیحی وصلیبی سامراج قابض ہوگیا تھا تو یہ مما لک دار الکفر ہوگئے تھے، پھر جب وہ ان مما لک سے رخصت ہوئے تو ان کے بعد مرتدین ان مما لک کے حکمراں ہوگئے(۸۹)۔

بعض حضرات لکھتے ہیں کہ : ''اگر کسی ملک میں مسلمان رہ رہے ہوں اور وہاں اسلام کی حکمرانی نہ ہو، بلکہ نظام کفر کی حکمرانی ہو، تو اس ملک کے مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ وہاں کے حکام سے قتال کریں حتی کہ ملک میں اسلام کی حکمرانی آجائے۔ اس ملک میں مقیم مسلمانوں کے لئے واجب ہے کہ وہ جنگ کریں اور جنگ کی تیاری کریں، بشرطیکہ وہ اس پر قادر ہوں''(۹۰)۔

فقہ اسلامی اور دیگر اسلامی امور ومعاملات پر گہری نظر نہ رکھنے والوں خصوصاً جذباتی نوجوانوں کی جانب سے نظریہ دارالاسلام ودارالحرب کا مندرجہ بالا فہم اور اسے جدید دور میں نافذ کرنے کی تگ ودو کی وجہ سے دنیا میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے جسے کبھی ''دہشت گردی''، کبھی ''اسلامی تشدد'' اور کبھی ''مسلح اسلامی گروپ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس صورتحال کا دفاع یہ کہہ کر نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کاروائیاں اس لئے کی جارہی ہیں کیونکہ بہت سارے مسلم مما لک مختلف مشرقی ومغربی مما لک کی چیرہ دستیوں کا شکار ہیں۔ وطن اور جان ومال کے دفاع کا حق ایک جائز حق ہے جسے اسلامی شریعت نے تسلیم کیا ہے، اسے سابقہ شریعتوں نے بھی تسلیم کیا تھا اور جدید دور میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین نے بھی تسلیم کیا ہے، لیکن اس دفاع کی آڑ میں بے گناہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کو قتل کرنے، انہیں اغوا کرنے، ان کے ساتھ تشدد کرنے اور ان کے مال ودولت کو لوٹنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ جائز جہاد جس کے اصول وضوابط متعین ہیں اور جن اصول کے ذریعہ جہاد کے مقاصد بغیر کسی زیادتی کے حاصل ہوجاتے ہیں، کے درمیان او ران دہشت گردانہ

کارروائیوں کے درمیان فرق واضح کیا جائے جو جہاد کے نام سے انجام دی جارہی ہیں۔

تجاویز:

۱- نظریۂ تقسیم دار کا مطالعہ شرعی نصوص اوران عمومی قواعد کی روشنی میں کرنا چاہئے جنہیں شریعت نے موجودہ حالات کے تناظر میں پیش کیا ہے۔

۲- دو یا دو سے زائد دار میں دنیا کی تقسیم سے متعلق فقہی آراء کا از سرنو جائزہ لیا جائے، اس کے تاریخی پس منظر کو بیان کیا جائے، اور یہ بتایا جائے کہ وہ مسلمانوں کے موجودہ حالات سے کس قدر ہم آہنگ ہے۔

۳- فقہ اکیڈمیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے کہ وہ اس موضوع کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کریں، جس میں شرعی نصوص کے مقاصد کی رعایت کی گئی ہو، قدیم وجدید فقہاء کی آراء کو سامنے رکھا گیا ہو اور علم سیاست اور جدید بین الاقوامی تعلقات کا احاطہ کیا گیا ہو۔ اس کے بعد اس موضوع کے سلسلہ میں ایک واضح موقف اختیار کیا جائے۔

۴- میڈیا اور رابطہ کے مختلف ذرائع ووسائل کا استعمال کیا جائے اوران کے ذریعہ تقسیم عالم کے نظریہ کو لوگوں تک پہنچایا جائے، تاکہ کسی مسلمان کی پرتشدد کارروائی کے سلسلہ میں یہ نہ کہا جائے کہ اس کی بنیادی وجہ فقہاء کی آراء ہیں۔

۵- مسلمانوں وغیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت وکیفیت کو اسلام کے عمومی قواعد کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کے سامنے واضح کیا جائے۔

۶- اس موضوع پر بحث ومناقشہ اور اس سے متعلق واضح آراء اختیار کرنے کے لئے سمینار اور کانفرنس کا انعقاد کیا جائے۔

حواشی

۱۔ یعنی غیر یہودی قومیں، یہ لفظ درحقیقت عبرانی ہے، جوایک وادی کا نام ہے، یہ وہ وسیع وادی ہے جہاں حضرت موسیٰ کو دفن کیا گیا تھا۔ قاموس الکتاب المقدس، دائرۃ المعارف الکتابیۃ المسیحیۃ۔

۲۔ آیت: ۲۷، سورہ عنکبوت۔

۳۔ **تفسیر القرآن العظیم**، ابن کثیر، ۶۴۹/۴۔

۴۔ **أحکام أهل الذمة**، ابن قیم الجوزیہ، ص ۳۶۶:۔

۵۔ **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع**، الکاسانی، ۱۳۰/۷۔

۶۔ **فتح العزیز (شرح الوجیز)**، رافعی، ص ۸:۔ ۱۴۔

۷۔ **مصنفة النظم الإسلامية**، مصطفیٰ کمال وصفی، ص ۲۸۶:۔

۸۔ **شرح السیر الکبیر**، سرخسی، ۸۱/۳۔

۹۔ دیکھئے: **حاشیة ابن عابدین** ۱۷۵/۴۔ **بدائع الصنائع** ۱۳۰/۷۔ **آثار الحرب**، الزحیلی، ص ۱۷۰:، **العلاقات الدولية**، ابوزہرہ، ص ۵۳:۔

۱۰۔ دیکھئے: **حاشية الدسوقی علی الشرح الکبیر** ۵۷۰/۱۔

۱۱۔ دیکھئے: **أصول الدين**، ابومنصور البغدادی، ص ۲۷۰:۔ **حاشیة البجیرمی علی الخطیب** ۲۲۰/۴۔

۱۲۔ دیکھئے: **أحکام أهل الذمة**، ابن قیم ۳۶۶/۱۔

۱۳۔ دیکھئے: **شرح النیل** ۴۰۵/۱۰۔

۱۴۔ **السیل الجرار**، شوکانی ۵۷۵/۴۔

۱۵- المحلی، ابن حزم ۱۱/ ۲۰۰۔
۱۶- السیاسة الشرعیة أو نظام الدولة الإسلامیة، ص ۶۹:۔
۱۷- العلاقات الدولیة فی الإسلام، ص ۵۵:۔
۱۸- دیکھئے: أحکام الذمیین و المستأمنین، عبد الکریم زیدان، ص ۲۰: -۲۱۔
۱۹- دیکھئے: المقنع، ابن قدامہ ۱/ ۵۱۴۔ الفتاوی الکبری ۴/ ۱۳۳۔
۲۰- شرح السیر الکبیر، محمد بن حسن الشیبانی مع شرح السرخسی ۶/ ۲۰۳۱۔
۲۱- بدائع الصنائع، کاسانی، ص: ۱۳۰۔
۲۲- أحکام أهل الذمة، ابن قیم الجوزیہ، ج ۲، ص
۲۳- دیکھئے: فتح العزیز (شرح الوجیز)، رافعی، ص: ۸- ۱۴۔
۲۴- التشریع الجنائی فی الإسلام، عبد القادر عودہ۔
۲۵- السیاسة الشرعیة أو نظام الدولة الإسلامیة، ص ۶۹:۔
۲۶- دیکھئے: الإمام الشافعی ۴/ ۱۰۳۔ مغنی المحتاج ۴/ ۲۳۳۔
۲۷- العلاقات الدولیة فی الإسلام، محمد ابوزہرہ، ص ۵۷:۔
۲۸- شرح فتح القدیر، ابن ہمام ۷/ ۳۹۔
۲۹- المبسوط، سرخسی ۱۴/ ۶۹۔
۳۰- اختلاف الفقهاء، ابن جریر الطبری، ص ۸۲:۔
۳۱- البحر الرائق، ابن نجیم ۶/ ۱۵۷۔
۳۲- النوادر و الزیادات، ابن ابی زید القروانی ۳/ ۳۱۹۔
۳۳- المغنی، ابن قدامہ ۵/ ۲۰۷۔
۳۴- المغنی، ابن قدامہ ۸/ ۴۳۳۔

۳۵– أحكام القرآن، جصاص ۲/ ۴۲۵۔
۳۶– فتح العزیز (شرح الوجیز)، رافعی، ۱۱/ ۴۲۵۔
۳۷– المستدرک علی مجموع الفتاوی، ابن تیمیہ/ ۱۸۔
۳۸– الأم، شافعی، ۹/ ۳۱۰۔
۳۹– المغنی، ابن قدامہ، ۸/ ۴۳۸۔
۴۰– المغنی، ابن قدامہ، ۸/ ۴۵۸۔
۴۱– الأوسط فی السنن والإجماع والاختلاف، ابن منذر، ۱۱/ ۲۹۲۔
۴۲– المغنی، ابن قدامہ، ۸/ ۴۵۸۔
۴۳– المبسوط، سرخسی، ۱۰/ ۱۱۱۔
۴۴– اختلاف الفقھاء، ابن جریر الطبری، ص ۸۲:۔
۴۵– تفسیر القرطبی، آیت: ۹۴، سورہ نساء۔
۴۶– مجموعة فتاوی ابن تیمیه، ۵/ ۲۰۷۔
۴۷– فتاوی ابن تیمیه، ۲۸/ ۳۵۵۔
۴۸– النوادر والزیادات، ابن ابی زید القروانی، ۳/ ۳۲۰۔
۴۹– بدائع الصنائع، کاسانی، ۹/ ۴۱۵۲۔
۵۰– أحکام القرآن، جصاص، ۱/ ۶۸۔
۵۱– دیکھئے: المغنی، ابن قدامہ، ۱۰/ ۵۱۴۔ مغنی المحتاج، شربینی الخطیب، ۴/ ۱۳۹۔ نیل الأوطار، شوکانی، ۸/ ۲۹۔
۵۲– أحکام القرآن، جصاص، ۳/ ۲۱۶۔
۵۳– فتاوی ورسائل الشیخ محمد بن ابراهیم آل الشیخ، جمع وترتیب: محمد بن عبد

الرحمن بن قاسم، دیکھئے: أحکام الدیار و أنواعھا و أحوال ساکنیھا، محمد بن عبداللہ الغلیفی، ص۵۷:۔

۵۴– آیت: ۱۵۸، سورہ اعراف۔

۵۵– آیت: ۲۸، سورہ سبا۔

۵۶– آیت: ۱۰۷، سورہ انبیاء۔

۵۷– آیت ۲۱، سورہ بقرہ۔

۵۸– آیت ۲۷: ، سورہ تکویر۔

۵۹– لسان العرب، ابن منظور، ۲/ ۴۲۰–۴۲۱۔

۶۰– امام احمد، ۲/ ۴۸۲، حدیث: ۱۰۲۶۳۔ بخاری، ۴/ ۲۰۳، حدیث: ۳۴۴۳۔

۶۱– آیت: ۹۹، سورہ یونس۔

۶۲– آیت: ۱۵۶، سورہ اعراف۔

۶۳– مسند ابی یعلی ۲۵۸۴۔ بیہقی، شعب الایمان، ۱۱۰۶۔ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے، دیکھئے: السلسلۃ الصحیحہ، ۱۶۷۔

۶۴– ترمذی، عبداللہ بن عمروؓ سے مروی، کتاب البر و الصلۃ، باب ما جاء فی رحمة المسلمین، ۱۹۲۴۔ احمد ۹۴ ۶۴۔ حاکم ۴ ۲۷۷۔ ابوعیسی کہتے ہیں: ھذا حدیث حسن صحیح، علامہ البانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، دیکھئے: صحیح الجامع ۳۵۲۲۔

۶۵– بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی دعاء النبی ﷺ أمته إلی توحید الله تبارک و تعالی، ۱۴۹۶۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبیان و العیال و تواضعه و فضل ذلک، ۲۳۱۹۔

۶۶۔ بخاری ومسلم۔

۶۷۔ سیر أعلام النبلاء، ۵/ ۱۴۷۔

۶۸۔ تأسیس النظر، الدبوسی، ص۷۹:۔

۶۹۔ آیت: ۱۳۸، سورہ اعراف۔

۷۰۔ آیت: ۱۰، سورہ رحمن۔

۷۱۔ آیت: ۱۳۷، سورہ آل عمران۔

۷۲۔ آیت: ۱۵، سورہ ملک۔

۷۳۔ آیت: ۱۰، سورہ زمر۔

۷۴۔ امام احمد، حدیث نمبر: ۱۴۲۰۔

۷۵۔ دیکھئے: حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، ۱/ ۵۷۰۔

۷۶۔ حاشیة العدوی علی کفایة الطالب، ۱/ ۳۶۶۔

۷۷۔ فتاوی مصطفی الزرقا، ص۶۲۶:۔

۷۸۔ التشریع الجنائی فی الإسلام، عبد القادر عودہ، ۱/ ۴۲۱۔

۷۹۔ دیکھئے: آثار الحرب، وہبۃ الزحیلی، ص۱۶۷:۔ العلاقات الدولیة فی الإسلام، محمد ابوزہرہ، ص۵۱:۔

۸۰۔ فی مہب المعرکة، مالک بن نبی، ص۱۳۷:۔

۸۱۔ آیت: ۱۴۳، سورہ بقرہ۔

۸۲۔ دیکھئے: فقه التحضر الإسلامی، ڈاکٹر عبد الحمید النجار، ص۲۴:۔

۸۳۔ دیکھئے: مشروع العلاقات الدولیة فی الإسلام، المعهد العالمی للفکر الإسلامی، اشراف: ڈاکٹر نادیہ مصطفی۔

٨٤- http://www.islamfeqh.com/news/newsitem.aspx?newsitemID=3247

٨٥- http://www.news.bbc.co.uk/hi/arabic/world_news/newsid_3764000/3764422.stm

٨٦- مغنى المحتاج بشرح المنهاج، شربينى الخطاب، ٤/٢٣٩ـ

٨٧- الشخصية الإسلامية، تقى الدين النبهانى، ٢/٢٦٩ـ

٨٨- العلاقات الدولية فى الإسلام، سيف عبد الفتاح، ٢/٣٦٤ـ

٨٩- أحكام الديار وأنواعها وأحوال ساكنيها، محمد بن عبد الله الغليفى، ص: ٦٠ـ

٩٠- الشخصية الإسلامية، تقى الدين النبهانى، ٢/٢٧٠ـ